U11903 3-12-09

tle – MUNTAKHIB NAZMEIN

thor – Murattibe Idara Sawera.

blisher – Naya Idara (Lahore).

ate – 1946

ges – 127

ubjects – Urdu Shayari – Intikhab – Nazmein

۱۹۴۲ء

منتخب نظمیں

دارہ • لاہور

۱۹۴۶

منتخب نظمیں

مرتبہ

ادارہ "سویرا"

نیا ادارہ لاہور

بار اول

قیمت عہ

(رسکو پرنٹ کیپیٹل پرنٹنگ پریس لاہور میں چھپکر عسکر بکڈپو گجرات سے شائع ہوئی۔)

مندرجات

پیش لفظ

دوسری عالمگیر جنگ ۱۹۴۵ء میں ختم ہو گئی تھی، اس کے باوجود ۱۹۴۶ء کو امن کا سال نہیں کہا جا سکتا ——— چور منڈی بھی وہی، کرنسی کا پھیلاؤ بھی وہی، مہنگائی بھی اسی قدر، اور فوجی اداروں کی تعداد بھی کم و بیش زمانہ جنگ کی سی رہی ——— چنانچہ ہمارے شاعر جو ۱۹۳۹ء کے بعد فوجی اداروں اور فلم کمپنیوں میں ملازم ہو چکے تھے بدستور منقار زیر پر رہے، بلکہ ۱۹۴۶ء کے آغاز میں زمانہ جنگ کے استحصال شدہ روپے سے فلم کمپنیاں اور زیادہ وجود میں آ گئیں، جس کے باعث رہے سہے شاعر بھی "بزنس مین" بن کر رہ گئے، ان حالات کے پیش نظر ۱۹۴۶ء کی شاعری میں وہ شدت اور پھیلاؤ نہیں مل سکتا، جو اقبالؒ کی وفات کے بعد کے سالوں میں پایا جاتا ہے۔

۱۹۴۶ء کی شاعری کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے قدرے کمزور ہے، اس کی وجہ صاف ظاہر ہے، کہ سرکاری اور غیر سرکاری مصروفیتوں کے علاوہ اکثر شعرا اقتصادی تہذیبی کے وسائل سوچتے رہے ہونگے، یہ سال نفسیاتی طور پر بھی پہلے سالوں کی نسبت کم ہیجان خیز تھا

آٹھ، دس سال اُدھر 'جدید ادب'، 'نیا ادب' وغیرہم کا جو طوفان اٹھا تھا اپنی طبعی حالت پر آچکا تھا، ملک ہر قسم کے ادب پر تنقیدیں اور بحثیں کر چکا تھا، نئے لکھنے والے پرانے ہو چکے تھے اور سامعین مانوس۔

اس سال ترقی پسند شاعری کی رفتار، رومانی یا داخلی ادب کے مقابلہ پر بہت سست ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسری عالمگیر جنگ کے شروع ہوتے ہی ملک کے بڑے بڑے گروہوں نے اپنی اپنی تنظیم کا آغاز کر دیا تھا، تاکہ وہ بڑی بڑی طاقتوں کی چپقلش سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکیں، چنانچہ ۱۹۴۶ء تک ملک بیداری جاگرت کی بجائے، فرقہ وارانہ نیابت، فسادات، اور سیاسی تعطل کا شکار ہو چکا تھا ——— 'تاریخ'، 'عدم تشدد'، 'بین الاقوامیت'، 'آخری بات'، 'بادبان'، 'دھرتی کی آواز'، 'جاگیر'، 'جنسیں' وغیرہم نظمیں صحت مندانہ جذبات کی ترجمان ہیں، ان میں سے کم و بیش ہر نظم سماج کے خارجی رشتوں سے بندھی ہوئی ہے، اور کسی نہ کسی نئے اور بہتر افق کی طرف اشارہ کرتی ہے 'آخری بات'، 'جاگیر'، 'بادبان'، 'جنسیں' اور 'بین الاقوامیت' فارم کے لحاظ سے بھی پسندیدہ ہیں۔

رومانی یا داخلی شاعری میں پژمردہ لمحے شگفتہ لمحوں کو چھو رہے ہیں ——— 'غمگسار'، 'میں گنہگار ہوں'، 'شکست'، 'بازگشت'، 'خدا'، 'ساس'، 'وادی رنگ'، 'جنگلی پھول'، 'شراب'، 'امروز'، 'مراجعت'، 'اسلوب فکر کے اعتبار سے قابلِ ذکر ہیں۔ 'غمگسار'، 'فن'، 'بازگشت'، 'ساس'، 'وادی رنگ'، 'امروز' اور 'مراجعت' وغیرہم میں فارم کا بھی خاص اہتمام رکھا گیا ہے ——— یہ ہے ۱۹۴۶ء کی نظموں کا انتخاب! ———

ریلوے روڈ۔ لاہور ظہیر کاشمیری ۳۰۔ مارچ ۱۹۴۶ء

جنوری

ریت کے محل

سہارا

فسردہ لمحے شگفتہ لمحوں کو چھو رہے ہیں

مادرِ گیتی سے

یاد

بے پروا

آواز

خوش آمدید

غمگسار

بین الاقوامیت

یاد

میں گنہگار ہوں

مگرمچھ کے آنسو

آئینہ ٹوٹ گیا

فن

شکست

اختر الایمان

ریت کے محل

تجھے تو یاد نہ ہوگی وہ شام کیف آگیں
شفق کے رنگ میں لکھی ہوئی کہانی سی
مچل رہی تھی ترے رخ پہ تیری آنکھوں میں
ترے لبوں پہ حکایت تھی اک سہانی سی

مجھے گماں ہوا جیسے میں وہ مسافر ہوں
جو رات دن کی مسافت کے بوجھ سے تھک کر
یہ چاہتا ہو کہیں گوشۂ اماں مل جائے
جسے نہ زیست کا مقدور ہو نہ جائے مفر
جو ڈھونڈتا ہو اندھیرے میں اپنے گم کردہ
محبتوں کے ذخیرے ولول کے سرمائے

نہ سنگِ میل، نہ راہوں میں قافلوں کے نشاں
بسی ہوئی ہو نگاہوں میں راہ کی سختی
ہر ایک گام پہ صحرا بدوش تھے ذرّے
بھٹک رہے تھے بگولے سے رہنما لاکھوں
کہیں نہ چشمۂ شیریں نہ سایۂ اشجار
پڑے ہوئے تھے سرِ رہ شکستہ پا لاکھوں
جو اپنے دل میں کبھی شوقِ بیکراں لے کر
چلے تھے بارِ زمیں سوئے آسماں لے کر
دلوں کا درد نگاہوں کا سوز کام آیا!
"دیارِ ہُو" میں لبوں پر کسی کا نام آیا!
یہ کاروبارِ یہ محفل یہ رنگ زار یہ دھوم
سرود و نالہ کہیں، رقصِ ناتمام کہیں،
صدائیں کھوئی ہوئیں وسعتِ بیاباں میں
طلوعِ صبح میں غلطاں وہ رنگِ شام کہیں
حکایتِ گل و لالہ کے باب وا نہ ہوئے
کسی کے اشک بھی اُس وقت آسرا نہ ہوئے

میں استخوانِ شکستہ کے ڈھیر سے بچتا

"دیارِ ہُو" میں پریشاں خیال، آوارا

اسی تلاش میں پھرتا تھا کوئی رہ نکلے

اس اضطرابِ مسلسل سے پاؤں چھٹکارا

پھر ایک شام، ترے حسنِ لازوال کی خیر!

صدائیں آئیں، ادھر آ ترے آل کی خیر!

پھر ایک بار تصوّر کے رنگ محلوں میں

ہجومِ شوق ہُوا، شورِ ناؤ نوش ہُوا

دیئے جلائے گئے، راستوں میں پھول بچھے

حیاتِ رفتہ کا افسانہ بارِ گوش ہُوا

تڑپ کے ساز کے تاروں سے غم رُبا نغمے!

بساطِ خواب پہ انگڑائی توڑتے نکلے!

سکوں نواز دھندلکا سا چھا گیا ہر سُو

مرا یہ حال کہ جیسے کسی کو نیند آئے

خمارِ لطفِ مسلسل سے لڑکھڑایا میں

کنارِ ساز میں رقصاں تھے ہر طرف سائے

بڑھا یا دستِ تمنا کہ دامنِ امید

کہیں نہ عالمِ وارفتگی میں چھوٹ جائے

تلاش کرتا ہوں وہ ساعتیں جو کھوئی تھیں!

بگولے کاٹ رہا ہوں ہوائیں بوئی تھیں!

نہ وہ زمیں ہے نہ وہ آسماں نہ وہ شب و روز

کبھی سمٹتی، کبھی پھیلتی ہیں غم کی حدود

ٹھہر گئی ہے اک ایسے مقام پہ دنیا

جہاں نہ رات نہ دن ہے نہ بیکلی نہ جمود

پکارتے ہیں ستارے سنبھالتی ہے زمیں

ہر ایک شے سے گریزاں ابھی ہے میرا وجود

میں سوچتا ہوں کہیں زندگی نہ بن جائے

خزاں بدوشِ بہار و خمارِ زہر آلود!

(ادیب لطیف)

ادا بدایونی

سہارا

اِدھر دیکھ یہ ریشمیں مرمریں نرم بانہیں

یہ کلیوں کے گجرے، یہ حُسنِ شبستاں

لچیلی، رسیلی، حسیں مسکراتی ہوئی شوخ کلیوں کے گجرے

یہ حسنِ فروغِ جمالِ شبستاں!

یہ مرکز تری آرزوئے جواں کا

یہ حاصل تری زحمتِ جاوداں کا

تری سینہ کوبیِ پیہم کا، دردِ نہاں کا

"یہ قوسِ قزح کی چرائی ہوئی شوخ رنگت"

"یہ پھولوں کی نرمی، یہ کلیوں کی نزہت"

"ستاروں کی شوخی، بہاروں کی فطرت

یہ جاتی ہوئی کہکشاں کو سبک گام راہیں!
یہ بے چین ہیں امتحاں کو
یہی ریشمیں، نرم باہیں،
فروغِ شبستاں سے اب پھیر بھی لے نگاہیں،
یہ مانا کہ چشمِ فلک نے نہ اب تک جھلک دیکھ پائی
مبادا پڑے بال ان آئنوں میں
نہ زخمِ نگہ آنے پائے!
مگر اب ذرا آزما ان کی ہمت
یہ مدّت سے بے چین ہیں امتحاں کو
تری تیرہ بختی، تری بے نوائی
ترے اشکِ پیہم، تری آہِ سوزاں
ترے درد کا اب بھی ممکن ہے درماں!
تجھے جس سہارے کی ہے جستجو مدتوں سے
ز فیضِ تمنّا ابھی مل بھی جائے
بہت ہے کہ اب تک جواں ہیں ارادے

ذرا حوصلے دیکھ ان کے !

یہی ریشمیں، مخملیں، مرمریں باہیں

جو چاہیں،

اٹھا کر پٹاک دیں زمین و زماں کو

ترے آسماں کو

ترے آسمانوں کے رازِ نہاں کو

یہ حُسنِ فروغِ جمالِ شبستاں !

(از سباطیلہ ۔ ۱)

انجم رومانی

فسردہ لمحے شگفتہ لمحوں کو چھو رہے ہیں

پھسلتے ملبوس نغمۂ بے صدا ہیں، ہیں نے
سُنے ہیں ایسے ہزاروں نغمے
ہزاروں نغمے سُنے ہیں میں نے
پھسلتے ملبوس، کھلتی کلیاں، اُمنڈتی خوشبو
ڈھلکتی پلکیں، بکھرتے گیسو.....

سیاہ گیسو....
دبیز بادل۔
دبیز بادل مری نگاہوں پہ چھا رہے ہیں
دبیز بادل یہ کیسے مبہم نقوش اپنی گھٹاؤں میں دکھا رہے ہیں

کبھی کسی ڈبڈباتی کشتی کا رقص دیکھا ہو میں نے جیسے —
ابھی ابھی ایک داستاں تھی مرے خیالوں کی سلوٹوں میں۔۔۔

سنو! یہ مسلی ہوئی جبیں کچھ بتا رہی ہے
وہ دیکھو بادل نئے نقوش اب گھلاوٹوں میں دکھا رہا ہے
کچھ ایسے، جیسے۔۔ ۔۔کچھ ایسے، جیسے۔۔۔۔۔
ابھی ابھی ایک داستاں تھی مرے خیالوں کی سلوٹوں میں۔

کبھی کسی غوطہ زن کو دیکھا ہے، کیسے نظروں سے کھیلتا ہے!
کبھی عیاں ہے، کبھی نہاں ہے؛
ابھی یہاں تھا اور اب کہاں ہے؟
وہ دیکھو پھر اُس نے سر نکالا
وہاں جہاں تیرتا ہے لہروں پہ سبز جالا
وہ اب کچھ ایسے دکھائی دیتا ہے جیسے اک جل پری نے پہنی ہوئی ہو
الماس رنگ مالا

وہ دیکھو! جیسے ہوا اُجالا
مرے خیالوں کی تیرہ و تار سلوٹوں میں
وہ دیکھو! آثارِ زندگی ہیں گزشتہ نغموں کی کروٹوں میں
گزشتہ نغمے شگفتہ لمحوں کی یادگاریں
شگفتہ لمحے چٹکتی کلیوں کے راز داں تھے۔

چٹکتی کلیوں کی بات کیا تھی۔
میں سوچتا ہوں چٹکتی کلیوں کی بات کیا تھی۔
چٹکتی کلیوں کی بات اک واہمہ ہے شاید
چٹکتی کلیوں کی آرزو میں ہزاروں جل پریاں مبتلا تھیں
چٹکتی کلیوں کی آرزو میں ہزاروں جل پریاں مبتلا ہیں
ہر ایک یہ چاہتی ہے مسرتیں ان کے نشیب میں ہو
مگر ہر اک جل پری ابھرتی ہے لڑکھڑاتی ہے پھیل جاتی ہے سطح دریا کی
وسعتوں پہ

چٹکتی کلیاں۔ بکھرتی پریاں

کبھی کسی ڈبڈباتی کشتی کا رقص دیکھا ہو میں نے جیسے۔
ابھی ابھی کوئی دھندلی خوشبو چٹکتی کلیوں سے آ رہی تھی۔

سنو! یہ جھٹکے ہوئے پریشاں سے بال کچھ کہنا چاہتے ہیں:
"بکھرتے گیسو، ڈھلکتی پلکیں، پھسلتے ملبوس واہمہ ہیں!
ادھورے نغمے سنے ہیں تم نے"

تمام نغمے، ادھورے نغمے ہیں۔ میرے کانوں کی چلمنوں میں
ہزاروں نغمے جھلک رہے ہیں
میں سوچتا ہوں کسی نے اب تک سُنا بھی ہے کوئی پورا نغمہ؟.....

(ساقی)

حامد عزیز مدنی

مادرِ گیتی سے!

یہ ترا ہمدمِ دیرینہ، رفیق و غمخوار
شبنمی نور میں ملبوس یہ مہتاب الجھتا ہوا برگد کی حزیں شاخوں سے
زہرخند اس کی ضیائے خاموش
یوں سرِ راہ تجھے دیکھ کے عریاں شاداب
اپنے ہی سینے کے داغوں میں بدل سکتا تھا
توڑ کر رات کی زنجیر نکل سکتا تھا
دور اس حلقۂ پروین و ثریا سے بھی دور
شب کے زندانِ بے سوز سے یہ بھی نہ ہوا ـ !

کیا مرے سامنے دہراتی ہے

وہ اساطیرِ جنوں خیز وہ پارینہ حدیث
جو کبھی بابل و یونان کی خوابیدہ فضاؤں میں لہو بن کے رواں رہتے تھے
لُوٹ کر لے گئے کچھ لوگ تبسم تیرا
درسگاہیں بھی ارسطو کی کمیں گاہیں تھیں
مشعلیں جلتی رہیں تیرہ مگر راہیں تھیں!

اور افسانے ہیں گذرے ہوئے روز و شب کے
خون ٹپکتا ہے در و بام کی پیشانی سے!
اور ویرانی لپٹ جاتی ہے ویرانی سے
شمعیں بجھتی ہیں دھواں اُٹھتا ہے!
اک نہ اک پردۂ اسرارِ جہاں اُٹھتا ہے
اور تغیر کے اشاراتِ نہاں پا ہی گئے
— راہ اپنی تیرے اشکوں میں تیری آہوں میں
تجھے آنا ہی پڑا —
سنگ و آہن کے ستونوں کی کڑی باہوں میں

تیرے سینے سے لپٹتے رہے یہ شعلہ و دود !

آج باقی نہیں پیراہن صد رنگ ترے
چھوڑ گلتی ہوئی پوشاک کے انباروں کو
اپنی عریانی پہ ہنس لینے دے بیماروں کو
آئے گا آئے گا کوئی تو شہابِ ثاقب
اس کے دامن میں دہکتے ہوئے انگاروں کی چادر کا اک آنچل ہی سہی
میں تماشائی سہی آج تری خلوت کا
میری اس حیرتِ طفلی پہ نہ جا
ہاں ! تجھے گھورتے رہنے کا خطا کار ہوں میں !

(ادبِ لطیف)

تصدّق حسین خالد

یاد

خود بخود دل میں کھبے جاتے تھے
مجھے معلوم نہ تھا
تیرے نظاروں میں یہ کیفیّت جذب بھی ہے
کسی منزل کی حدیں چھُو لی تھیں

زندگی، گرمِ سفر
روز نئی اک الجھن
آج کیا کرنا ہے
کل کیا ہوگا

ریت کا سیلِ رواں
اور یہ ابو ہر کی چلچلتی ہوئی دھوپ
دل کے اک دُور سے کونے میں چھپی بیٹھی تھی
دلہن کی طرح
وقت کچھ نہ کر سکا

پھر تری یاد خراماں آئی

گیت ہی گیت
محبّت کے پرانے رمنے
کسی نوخیز جوانی کا دہکتا ہوا پھول
روح کہتی ہے لگاؤں گی ستاروں کا سراغ
یہ مسرت میں چبھن کیسی ہے ؟

(ادبِ لطیف)

راجہ مہدی علی خاں

بے پروا

چھوٹے قد کی
گول مول سی
چھوٹی پھولی
گول مٹولو
اوڑھ کے چنری
تاروں والی
کبھی اِدھر کو
کبھی اُدھر کو
بے پروائی
سے پھرتی ہے

لیکن اُس کی
آنکھیں ہیں کہتی
" آؤ لڑکو
دیکھ لو مجھ کو
بولو! مجھ کو
کون چُنے گا؟
کون چُنے گا؟
کون چُنے گا؟"

ن۔م راشد

آواز

(ایک فوجی پروگرام کے تاثرات)

"۔۔۔ یہ دلّی ہے
اپنے غریب الوطن بھائیوں کے لئے
ہار غزلوں کے لائی ہے اُن کی بہن
اور گیتوں کے گجرے بنا کر
"چھما چھم چھما چھم دلہنیا چلی رے
یہ دنیا ہے طوفان میل
او رمدینے کے عربی جواں
تیری زلفیں ہمیں ڈس گئیں ناگ بن کر۔۔۔"
مگر اس صدا سے بڑا ناگ ممکن ہے
جو لے گیا ایک پل میں

ہزاروں کو غارِ فراموشگاری
میں یوں کھینچ کر ساتھ اپنے
کہ صدیاں گذرنے
پہ ان کی سیہ ہڈیاں بھی نہ شاید ملیں گی؟

جہاں سے یہ آواز آئی
اسی سرزمیں میں
سمندر کے ساحل پہ لاکھوں گھروں میں
دیئے ٹمٹمانے لگے
اور اک دوسرے سے
بہت دھیمی سرگوشیوں میں
یہ کہنے لگے:
"لو سنو اب سحر ہونے والی ہے
لیکن مسافر کی اب تک خبر بھی نہیں ہے!"

(ادبِ لطیف)

رفعت سروش

خوش آمدید

تم چلی آؤ مرے پاس یہاں کوئی نہیں

(۱)

غرقِ ظلمات ہوا چاند ستاروں کا نور
تیرگی سے ہے ہر اک ذرّہ دوراں مستور
جگمگاتی ہوئی شمشیر لئے پہلو میں — رقص کرتی ہیں گھٹاؤں کی گھنیری زلفیں
خامشی ہر در و دیوار پہ لہراتی ہے — ہانپتے ہانپتے دم توڑ چکی ہیں راہیں
"تم نہ آؤ گی" یہ رہ رہ کے خیال آتا تھا
لیکن اُمید کے میدان میں کھو جاتا تھا

(۲)

نیند بھی آئی دبے پاؤں سلانے کیلئے
یاس کے ہاتھ بڑھے شمع بجھانے کیلئے

شمعِ اُمید بہر رنگ مگر جلتی رہی ... میرے ایوانِ تمنا میں اُجالا ہی رہا
اور میں حسنِ تصور کا سہارا لیکر ... محفلِ شوق سجائے ہوئے بیٹھا ہی رہا

رنگ بھرتا رہا امید کے پیمانوں میں
گل کھلاتا ہی رہا یاس کے ویرانوں میں

(۳)

ان چمکتی ہوئی آنکھوں میں ندامت کیوں ہے؟
رخِ پرنور پہ یہ رنگِ خجالت کیوں ہے؟

کیا روایاتِ کہن سے ابھی مرعوب ہو تم؟ ... ابھی ماضی کے تسلسل کا اثر باقی ہے؟
سحرِ رنگین ہے فرسودگیٔ رسم و رواج ... کیا ابھی تک تمہیں اندیشۂ رسوائی ہے؟

خوں بہاتی ہو مچلتے ہوئے ارمانوں کا
رنگ اُڑاتی ہو محبت کے شبستانوں کا

مسکراؤ کہ بدلنا ہے محبت کا مزاج
رہ گئی راہ میں دم توڑ کے زنجیرِ سماج!
اب زمانے کی نگاہوں سے بہت دور ہیں ہم
یہ فضاؤں کا خم و پیچ! تو اک دھوکا ہے
نئے مسلک، نئی منزل، نئی راہیں اپنی
اب ہمیں جادۂ پامال سے کیا لینا ہے
بیٹھ بھی جاؤ مرے پاس یہاں کوئی نہیں
تھرتھراتا ہوا دیوار پہ سایہ بھی نہیں

(شاہکار)

ضیا جالندھری

غمگسار

رات خاموش ہے روٹھی ہوئی قسمت کی طرح
دور ہی دور سے چپ چاپ گزر جائے گی
تم تو کچھ بات کرو، تم مری قسمت تو نہیں
اس خموشی میں ہے احساس گرانبارئ زیست
اس خموشی ہی سے گھبرا کے یہاں آیا ہوں

دیکھو جلتا ہوا اک پھول ہے وہ آتش دان
شعلے اٹھتے ہیں پر اس بت کو نہیں چھو سکتے
بت تو بیگانۂ آلام ہنسے جاتا ہے
کیسے شعلے ہیں کہ جلتے ہیں مگر آنچ نہیں

کوئی محسوس نہ کر پایا مرے دل کی جلن

میں سمجھتا تھا کہ پتھر بھی پگھل سکتے ہیں؛
میں نے دیکھا تھا کہ جلتے ہیں خزاں میں اشجار
اور ہر شام کسی غم سے سلگتا ہے فلک،
ان کو ہے اپنے ستاروں سے شگوفوں سے غرض
میں کسی کو بھی مگر آج تک اپنا نہ سکا۔

یہ ستارے یہ شگوفے تو پلٹ آتے ہیں۔
میری روٹھی ہوئی قسمت بھی کبھی آئے گی؟

کتنی یادیں غمِ امروز سے جاگ اُٹھتی ہیں
گرتے پتوں سے بہاروں کا خیال آتا ہے
یادیں ارمانوں میں گھلتی ہیں تو غم بڑھتا ہے
اب بھی ہے جینے کا ارمان مگر یہ یادیں

میرے قدموں سے لپٹتی ہوئی زنجیریں ہیں

(۲)

ابھی اشجار نے پہنا نہ تھا پتّوں کا لباس
خواہشیں شاخوں میں لہرائی نمی کی صورت
فصلِ گل کا مجھے پیغام دیئے جاتی تھیں،
اور پھر ہنستی ہوئی جانِ بہار آ پہنچی
میرے ارمان تھے شاخوں پہ شگوفوں کی طرح
انھی شاخوں کے تلے پرتوِ خور سے رخشاں
وہ مرے پاس کھڑی رنگِ چمن دیکھتی تھی،
اس کے دامن میں کئی پھول تھے، شبنم آلود
اس کا چہرہ بھی تو اک پھول تھا ہنستا ہوا پھول
میرے سینے میں کئی سیلِ فراواں اُٹھے
ایسے میں وقت کا احساس کسے رہتا ہے،
ہوش آیا تو خزاں مجھ پہ کھڑی ہنستی تھی
حسرت گریہ بھی طوفان بداماں لیکن

درد وہ سنگِ گراں ہے کہ پگھلتا ہی نہیں

اب مری زیست نہ برف ڈھلانوں کیطرح
صرف اک مرمریں مرقد ہے مرے ماضی کا

زندگی برسے ہوئے ابر کی مانند اُداس
آج بھی کھوئے ہوئے وقت کی راہ تکتی ہے

رات خاموش خلا بن کے چلی آتی ہے
اس خموشی ہی سے گھبرا کے یہاں آیا ہوں

میں سمجھتا تھا کہ پتھر بھی پگھل سکتے ہیں
لیکن انسان تو پتھر بھی نہیں اس کی ہنسی
اک تذبذب میں مجھے چھوڑ کے چل دیتی ہے

آج اس زیست سے گھبرا کے یہاں آیا ہوں
آج میں نے وہ ستارہ سرِ مژگاں، دیکھا
جو کسی اور کے غم سے بھی چمک اٹھتا ہے
تم نے محسوس کیا ہے مرے غم کو شاید
تم پہ بھی ایسی ہی راتیں کبھی آئی ہوں گی
تم بھی کچھ بات کرو، تم مری قسمت نہ سہی
تم مری بات، مرا غم تو سمجھ سکتی ہو

اس خموشی میں ہے احساسِ گرانباریٔ زیست
اس خموشی ہی سے گھبرا کے یہاں آیا تھا

(ہمایوں)

ظہیر کاشمیری

بین الاقوامیت

ڈور اُدھر۔ جب میرے اجداد نے تقسیم کیا
رنگ اور نسل کی بنیاد پہ انسانوں کو
پرچم امن اتارے گئے تحقیر کے ساتھ
جنگ کی گونج نے تھرا دیا ویرانوں کو

۔۔۔ تیغ بردار، جگر دار جواں آتے تھے
اور وہ نکلے رجز ”ہم ہیں قبیلے کے امیر
وہ قبیلہ کہ پہاڑوں کو دھنک کر رکھ دے
وہ قبیلہ کہ تہوّر میں نہیں جس کی نظیر
وہ قبیلہ کہ بگولوں پہ کمندیں ڈالے

وہ قبیلہ کہ شہیدوں کا لہو جس کا خمیر
کون اس آہنی دیوار سے ٹکرائے گا؟
پنجۂ موت میں لے آتی ہے کس کو تقدیر؟"

اسی انداز سے بہتا رہا انساں کا لہو
اسی انداز سے ہر ملک میں چمکی شمشیر

صبح ہوتی ہے تو سورج کی طلائی کرنیں
مشرقی کوہ پہ سمٹی ہوئی نظر آتی ہیں
دن چڑھے تک یہی سمٹی سی طلائی کرنیں
بحر و بر حلقۂ انوار میں لے آتی ہیں

تابشِ زیست قبیلوں سے نکل کر پھیلی
جا ملی پیکن و پیرو کے سمن زاروں میں
نور کی موج کسی طور نہیں بٹ سکتی

رنگ اور نسل کی گرتی ہوئی دیواروں میں

تاج، اہرام، ابوالہول، معلق باغات
ایک مضبوط تسلسل کا پتہ دیتے ہیں۔

(ادبِ لطیف)

علی سردار جعفری

یاد

زمیں پہ رات کی پلکوں کی چھاؤں پڑتی ہے
اندھیرا سخت خموشی کا بار اٹھائے ہوئے

ہوا میں اڑتے ہیں لمحات جگنوؤں کی طرح
فضا کے سینے میں اک آگ سی لگائے ہوئے

سرک رہے ہیں اندھیرے کے مخملیں پردے
نکل رہا ہے کوئی جسم کو چرائے ہوئے

ابھر رہا ہے کوئی وقت کے تلاطم سے
جبیں پہ قوس قزح کی کماں جھکائے ہوئے

خمارِ نیم شبی کا ہے آنکھ میں کاجل
ہتھیلیوں پہ حنا کے کنول جلائے ہوئے

مری جوان تمنا کے سرخ پھولوں سے
سیاہ زلف کو گوندھے ہوئے سجائے ہوئے

وہ دھندلے دھندلے ستاروں کے نرم جھرمٹ ہیں
کنارے سبز دوپٹے کے جگمگائے ہوئے

دھڑکتے سینے پہ آنچل کی ریشمی شکنیں
گزشتہ شب کی حسیں چاندنی چھپائے ہوئے

سڈول اور سبک بازوؤں کی لرزش میں
شباب شعر کی انگڑائیاں دبائے ہوئے

کھڑی ہے خواب و فسانے کی سرحدوں کے قریب
اندھیری رات کے دل میں چمن کھلائے ہوئے

وفا کے جوش سے چہرے پہ روشنی دل کی   حیا کے رنگ سے رخسار تمتمائے ہوئے
بھووں پہ کتنی ہی انکار کی جبیں شکنیں   لبوں پہ کتنے ہی اقرار مسکرائے ہوئے
مگر جبیں پہ محبت کے خون کا ٹیکا   بڑے غرور بڑے ناز سے لگائے ہوئے

یہ ایک یاد ہے بیتے ہوئے زمانے کی
جو میرے سینے پہ بیٹھی ہے پھن اٹھائے ہوئے

(ادب لطیف)

سیّد فیضی

میں گنہگار ہوں

ستارہ ٹوٹا کہ شعلہ بھڑکا!
سیاہ دیوِ فلک کا سینہ بس ایک لمحے کو کھل گیا تھا
تڑپتی بل کھاتی ایک زرّیں لکیر آنکھوں میں پھر گئی تھی
نہیں — ! یہ شیطاں کے سر پہ انگارے آسماں سے برس رہے ہیں
غریب کو جگمگاتے افعی نہ جانے کس دن سے ڈس رہے ہیں!

میں سوچتا ہوں، خموش ہوں۔ دم بخود ہوں اور پھر بھی سوچتا ہوں
عجب نہیں کم نگاہیاں مجھ کو میری نظروں میں پست کر دیں
قصور ہی کیا تھا چشم پوشی۔ اور اس پہ فطرت کی گرمجوشی!
نہ جانے یہ جگمگاتے افعی غریب کو کب سے ڈس رہے ہیں

سیاہ چادر کی چھاؤں میں یوں تو کھل چکے ہیں ہزار سینے
چمکتے اور پُر بہار سینے!
تڑپتے۔ بل کھاتے ایک زرّیں لکیر سے داغدار سینے!!
اور آج بھی کھل رہے ہیں لاکھوں ــــــ
قصور ہی کیا ہے؟ چشم پوشی ــــــ اور اس پہ فطرت کی نرم کوشی!
نہ تارا ٹوٹا ــــــ نہ شعلہ بھڑکا
بس ایک دھڑکا سا دل نے آخر میں خود ہی محسوس کر لیا تھا۔

(ادبِ لطیف)

مخمور جالندھری

مگرمچھ کے آنسو

سنتے ہیں۔ یاد مصیبت میں خدا آتا ہے
آسرا ۔۔ اک یہی مجبور کی تقدیر میں رہ جاتا ہے

"کھول دو بند کلیساؤں کے در کھول بھی دو
مانا مانوس نہیں ہاتھ دعاؤں سے ۔۔ دعائیں مانگیں
مملکت پر کہیں خورشید نہ ہو جائے غروب
حکم دے دو کہ سبھی اپنے خداؤں سے دعائیں مانگیں"

جی پہ بن جائے تو ذلّت بھی اُٹھا لیتے ہیں
سنتے ہیں ۔۔ باپ مصیبت میں گدھے کو بھی بنا لیتے ہیں

"ناگ ہے اپنا معاون تو کوئی بات نہیں
کام لینا ہے ہمیں ناگ خزانے پہ بٹھالو اپنے
شہد کا گھونٹ سمجھ کر سمِ قاتل پی جاؤ
کسی قیمت کسی اجرت پہ اسے ساتھ ملالو اپنے"

سارا دھن جاتا ہے تو نصف لٹا دیتے ہیں
سنتے ہیں — بچے جو چیخیں انہیں افیون کھلا دیتے ہیں
"سب کو بخشیں گے مصائب کی سلاسل سے نجات
جنگ لڑتے ہیں صداقت کی، مساوات کی اعلاں کر دو
اپنی من مانی ہی آخر ہمیں کریں گے، اب تو
دہر کو وعدۂ پُرکیف سے منّت کشِ احساں کر دو"

ناگ ڈستا ہے۔ اسے دودھ پلاؤ کتنا
شو کھی بیری سے کبھی بیر نہیں جھڑتے، ہلاؤ کتنا

"عہدِ آلام بھی معدوم، خدا بھی معدوم
کوئی خدشہ نہیں پھر سے ستم و جور کو ارزاں کر لو
فتح کا جشن منانا ہے مگر دھوم کے ساتھ
اپنے گھر حسن سے یا خون کی بوندوں سے چراغاں کر لو
اپنے محکوموں کی ہستی بھی کوئی ہستی ہے
یہ تو وعدوں پہ بھی جی سکتے ہیں ان سے نئے پیماں کر لو"

تیرگی بڑھتی ہے طوفان امڈ آتا ہے
بدلیاں چھا کے برستی ہیں فلک پھر سے نکھر جاتا ہے

(ادبِ لطیف)

منظر سلیم

آئینہ ٹوٹ گیا

میں نے ہر لمحہ ۔ برائے زندگی
اک نئی زنجیر کا بوسہ لیا
دیکھتے ہی دیکھتے بل کھا گئے
وقت کی پگڈنڈیوں پر چھا گئے
مضمحل ہونٹوں کے لرزیدہ نشاں
آج تک میں اس طرح خاموش تھا
جیسے یہ منحوس سائے، یہ دھواں
ایک منزل، منزلوں کی رازداں
آج پچھلی شب فضا کی چشم نم
مضمحل ہونٹوں نے کچھ مجھ سے کہا

بت کدہ انگڑائی لے کر جاگ اٹھا
اپنے آوارہ تخیل کی قسم
عذر خاموشی ستاتا ہے مجھے
ماضی، جیسے کھائے جاتا ہے مجھے

(ہمایوں)

احمد ندیم قاسمی

فن

ایک رقاصہ تھی، کس کس سے اشارے کرتی
آنکھیں پتھرائیں، اداؤں میں توازن نہ رہا
ڈگمگائی، تو سب اطراف سے آواز آئی۔
"فن کے اس اوج پہ اک تیرے سوا کون گیا!"
فرشِ مرمر پہ گری، گر کے اُٹھی، اُٹھ کے جھکی
خشک ہونٹوں پہ زباں پھیر کے پانی مانگا
اوک اُٹھائی تو تماشائی سنبھل کر بولے۔
"رقص کا یہ بھی اک انداز ہے —— اللہ اللہ!"
ہاتھ پھیلے رہے، سِل سی گئی ہونٹوں سے زباں
ایک رقاص کسی سمت سے ناگاہ بڑھا،
پردہ سرکا تو معاً فن کے پجاری گرجے۔
"رقص کیوں ختم ہوا؟ وقت ابھی باقی تھا!"

(ادبِ لطیف)

قیوم نظر

شکست

پھر دل جلی شام آگئی
چمگادڑوں کے سائے ہیں
بے چارگی کہنا گئی

کیا کیا نہ باتیں ہوگئیں
شیشم کی شاخوں میں حسیں
چڑیاں چہک کر کھو گئیں

ہیں ناشناسائے سکوں

اور ہر طرف پھیلا ہوا
پرہول صحرائے سکوں

وحشت سی ہوتی ہے مجھے
ہر سرسراہٹ اک نیا
نشتر چبھوتی ہے مجھے

یوں بڑھ رہی ہے تیرگی
جیسے جبینِ صبح سے
کرنیں نہ پھوٹیں گی کبھی

دُوری کا افسوں مٹ چکا
حدِّ نگہ کے اُس طرف
شاید مرا کچھ بھی نہ تھا

تکتا ہوں اب جانے کہاں
اپنے خیال و خواب کو
لے جاؤں بہلانے کہاں

(ہمایوں)

مارچ

عدم تشدّد

قتیل شفائی

عدم تشدّد

ایک نازک سی کرن اور اندھیرے کا غرور؟

یہ تو ممکن ہی نہیں ہے کہ اجالا ہو جائے
شاید اب کے بھی کرن تیرہ شبی میں کھو جائے

میں نے تاریخ کے اوراق کو شمار پایا
ہر زمانے کی نظر میں یہ کرن جاگی تھی،
وہ کرن جس میں تمنّاؤں کا خونی دریا
موج در موج طلاطم کا سہارا لے کر
ایک بے نام سی وادی میں نکل جاتا تھا
لیکن انجام کے بے ربط فسانوں کا نچوڑ
ایک اڑتے ہوئے بادل میں سمٹ آتا تھا

نامکمّل ہی سہی عہدِ رواں کی تاریخ!
لیکن اک روز یہ تاریخ مکمّل ہو کر
چند کرنوں کے چمکنے کی گواہی دے گی
جن میں حدّت نہ رہی تیرہ شبی میں کھو کر

چار جانب وہ گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا
جیسے پربت کوئی میداں میں لڑھک آیا ہو
جیسے بھونچال زمانے کی پلٹ دے کایا
— یہ اندھیرا ہے کہ تاریخ کے گنجان حروف
جن پہ لہراتا ہے ماضی کا پرافشاں سایا
اے مورّخ! اسی سائے میں چھپی ہے وہ کرن
جس نے آفاق کے ہر نقش کو دھندلا پایا

شاید اب بھی یہ کرن تیرہ شبی میں کھو جائے
یہ تو ممکن ہی نہیں ہے کہ اجالا ہو جائے
ایک نازک سی کرن اور اندھیرے کا غرور؟

(ہمایوں)

اپریل

بازگشت

یوسف ظفر

بازگشت

بسیط جادوں، عمیق غاروں، طویل راہوں پہ چل چکا ہوں،
چمکتی لہروں سے آسماں کی بلندیاں تک مرے لئے تھیں
مرے مراحل ہیں وہ تصور کی وادیاں بھی ہیں، وسعتیں بھی
جنہیں حقیقت کی ٹھوس نظریں نہ پاسکی ہیں، نہ پاسکیں گی
ہر ایک منظر کھلا ہوا ہے مری نگاہوں کی حیرتوں میں
کہ اب بھی ہر راہ اجنبی ہے
کہ اب بھی ہر راہ اجنبی اجنبی نگاہوں سے دیکھتی ہے
یہ جانی پہچانی میری راہیں مری صداؤں پہ چونکتی ہیں
اگرچہ ان کے لبوں پہ اب بھی مرے تبسم کی لرزشیں ہیں
اگرچہ ان کی ہوا کے سینے میں میرے نغمے مچل رہے ہیں
اگرچہ ان کے سرکتے خوابوں میں عکس ہے میری آرزو کا!

قدم قدم پہ مگر یہ راہیں مجھے صدا دے کے روکتی ہیں
وہ اک صدا دے کے ٹوکتی ہیں کہ جس کا مفہوم اجنبی ہے

بلندیوں پر وہی چٹانیں ہیں اب بھی جو اس سے پیشتر تھیں
وہی چٹانیں کہ جن کی سنگینوں پہ سر رکھ کے سو گئی تھی،
مرے لڑکپن کی مسکراتی ہوئی نگاہوں کی جاذبیت ——
یہیں مرے بے خبر تصوّر نے ایک دنیا تراش لی تھی
جہاں کئی کارواں بہاروں کے رقص کرنے کو آ گئے تھے
یہ دنیا اب میرے تجربوں کی حرارتوں سے پگھل گئی ہے
اب اس کی یادیں یہیں انہیں سرمئی چٹانوں میں کھیلتی ہیں
جو مجھ کو پہچانتی نہیں ہیں
یہی چٹانیں مرے تصوّر کو آسرا دے چکی ہیں اب تک
یہی چٹانیں کئی نشیبوں میں مجھ کو آواز دے چکی ہیں،
خیال پرواز دے چکی ہیں ——

طویل راہوں کی سرد باہوں نے مجھ کو خاموش کر دیا تھا
مجھے گماں تھا کہ اب کسی موڑ پر کسی آشنا کو پا کر

میں اپنی تنہائیوں کی، ویرانیوں کی باتیں سنا سکوں گا
کسی سے میں داد پا سکوں گا
مرے لئے بیقرار ہوں گے مرے خیالوں میں بسنے والے
مجھے گماں تھا کہ میری آمد پہ ان کی نظریں چمک اُٹھیں گی
مگر یہ بے نور سرد آنکھیں، مگر یہ بے آب زرد چہرے
مجھے صدائیں دے کے روکتے ہیں کہ جس کا مفہوم اجنبی ہے —

بسیط جادوں، عمیق غاروں، طویل راہوں پہ چل چکا ہوں
کہ آج تک میری گم نظروں کو ایک منزل کی آرزو تھی
اسے بھی میری شکستِ امید نے ہوا میں اُڑا دیا ہے
ہوا کی منزل کہاں ہے! — کوئی ہوا کی منزل کو پا سکا ہے؟

اگر سفر سے مفر نہیں ہے تو قیدِ منزل کا ذکر کیا ہے
کوئی بہار و خزاں مری راہ میں نہ آئیگی — چل رہا ہوں
عمیق غاروں میں ڈھل رہا ہوں —

(ہمایوں)

مئی

دعا

خدارا

خلیل الرحمٰن

دعا

ریگِ صحرا میں کوئی شاخ نہیں پھول نہیں
ریگِ صحرا میں کہیں ایک پرِ کاہ بھی موجود نہیں
ہر افق وسعتِ صحرا کا فسوں ہے گویا!
دور تک کچھ بھی نہیں — کچھ بھی نہیں!
ریگِ صحرا میں کہیں برگِ خزاں تک بھی نہیں
جوہرِ لالہ و گل کی لیکن
ذرّے ذرّے سے مہک آتی ہے
ریگِ صحرا میں ہے اک گہرا طلسمِ خوشبو
کس نے ہر ذرّۂ صحرا کو مہک بخشی ہے؟!
روحِ گلزار میں صحرا کو بسایا کس نے؟!

کس نے صحرا کو مہک بخشی ہے؟!
ہم بھی ویران تمنائیں لئے پھرتے ہیں
ہم بہاروں کے تصور سے بھی محروم ہوئے پھرتے ہیں
دل میں اب نقشِ خزاں تک بھی نہیں
عہدِ رفتہ کی بہاروں کا نشاں تک بھی نہیں
دل میں ویرانۂ ارماں کے سوا کچھ بھی نہیں
کچھ نہیں اس کے سوا کچھ بھی نہیں!
روحِ گلزار میں صحرا کو بسانے والے
ہم بھی ویران تمنائیں لئے پھرتے ہیں!

(ہمایوں)

میراجی

خدا

میں نے کب دیکھا تجھے روئے ابد
ان گنت گہرے خیالوں میں ہے تیرا مرقد
صبح کا شام کا نظارہ ہے
ذوقِ نظارہ نہیں چشمِ گداگر کو مگر

میں نے کب جانا تھا تجھے روحِ ابد
راگ ہے تو، پہ مجھے ذوقِ سماعت کب ہے
مادیت کا ہے مرہون مرا ذہن ..... مجھے
چھو کے معلوم یہ ہو سکتا ہے شیریں ہے ثمر
اور جب پھول کھلے اس کی مہک اڑتی ہے

اپنی ہی آنکھ ہے اور اپنی سمجھ کس کو کہیں..... تو مجرم

میں نے کب سمجھا تجھے روحِ ابد
خشک مٹی تھی مگر چشم زدن میں جاگی
اسے بے تاب ہوا لے کے اڑی
پھر کنارہ نہ رہا، کوئی کنارہ نہ رہا
بن گیا عرصۂ آفاق نشانِ منزل
زور سے گھومتے پہیئے کی طرح
ان گنت گھرے خیال ایک ہوئے
ایک آئینہ بنا
جس میں ہر شخص کی اپنی تصویر
اپنے ہی رنگ میں ایک لمحہ دکھائی دی تھی
ایک لمحہ کے لئے
بن گیا عرصۂ آفاق نشانِ منزل

میں نے دیکھا ہے تجھے —— روحِ ابد
ایک تصویر ہے —— شبِ رنگ —— مہیب
درِ معبد پہ لرز اُٹھے ہر اک کے پاؤں
ہاتھ ملتے ہوئے پیشانی جھکائے دونوں

میں تجھے جان گیا روحِ ابد
تو تصوّر کی تمازت کے سوا کچھ بھی نہیں
چشمِ ظاہر کے لیے خوف کا سنگیں مرقد
اور مرے دل کی حقیقت کے سوا کچھ بھی نہیں
اور مرے دل میں محبّت کے سوا کچھ بھی نہیں

(ہمایوں)

جون

تاریخ
زیر و بم
احساس

جاں نثار اختر

تاریخ

ہاں تجھے ہر ایک کا طرزِ حکومت یاد ہے
بادشاہانِ سلف کا تیرے ہونٹوں پہ ہے نام

ہاں تجھے ہر مملکت کی ابتدا کا علم ہے
ہاں تجھے معلوم ہے ہر سلطنت کا اختتام

ہاں تجھے ازبر زمانے کے گذشتہ واقعات
ہاں ترے وردِ زباں دنیا کی تاریخیں تمام

داستانِ روم و بابل، قصۂ یونان و ہند
واقعاتِ مصر و اندلس، سرگذشتِ چین و شام

تو سلاطینِ سلف کی سیرتوں کا رازداں
معتبر تیری روایت، مستند تیرا کلام

ایک دو کیا کتنی تصویریں دکھا سکتا ہے تو
ایک کے زانو پہ قرآں ایک کے ہاتھوں میں جام

تو بتا سکتا ہے تھیں ہر اک حرم میں باریاب
کتنی گل چہرہ کنیزیں کتنے بدہیئت غلام

یاد تجھ کو کُل جہاں کی معرکہ آرائیاں
جنگ کا ہر اک زمانہ جنگ کا اک اک مقام

ملک گیری کی ہوس میں مذہبوں کے نام پر
ہو چکیں دنیا میں کتنی بار تیغیں بے نیام

جانتا ہے تو کہ کن شہزادیوں کے عشق پر
لٹ گئے ملک و حکومت ہو گئیں قومیں تمام

نادر و چنگیز کی خوں ریزیوں کے ماسوا ‏ ‏ تو اگر چاہے تو گنوا دے ہزاروں قتلِ عام

حفظِ پشتوں کی مسلسل دشمنی کے ماجرے ‏ ‏ یاد تجھ کو سارے نسلاً بعد نسلٍ انتقام

اے مورخ آج خود تجھ سے ہے شاعر کا سوال ‏ ‏ کون شاعر اک صدائے زندگی جس کا پیام

بول کیا تاریخ ہے فہرستِ اسمائے رجال

بول کیا تاریخ ہے تقویمِ پارینہ کا نام

اے کہ تو ناواقفِ سرِ نہانِ زندگی ‏ ‏ آ بتاؤں میں تجھے تاریخ کا رازِ تمام

ایک واثق علم ہے اُن فطرتی آئین کا ‏ ‏ حکم سے جن کے بدلتا ہے زمانے کا نظام

نوعِ انسانی کے ذوقِ ارتقا سے آگہی ‏ ‏ زندگی کو جس نے دے رکھا ہے فرمانِ خرام

علم کی ان روز افزوں قوتوں کی سرگزشت ‏ ‏ عرصۂ فطرت میں جو پھیلا رہی ہیں اپنے دام

جن کے تحت آئینِ پیداوار کی تبدیلیاں ‏ ‏ ہاں یہی تبدیلیاں ہیں دورِ نو کا اہتمام

ہاں یہی تبدیلیاں ہیں فکر کو مہمیزِ نو ‏ ‏ ہاں یہی تبدیلیاں ہیں جن کو تازہ دو پیام

مختلف طبقوں کی باہم کشمکش کی داستاں ‏ ‏ ایک کو شوقِ تگ و دو ایک کو فکرِ قیام

نور و ظلمت کی بہم آویزشوں کا ماجرا ‏ ‏ زندگی کے سرد و لب پہ جھلکتی صبح و شام

عصرِ نو کا زمزمہ دورِ قدامت کا خروش ‏ ‏ ایک گو بجنے ساز کا جیسے بدلتا ہو مقام

واقعاتِ زندگانی کے تسلسل کا پتہ ‏ ‏ مختلف ادوار کے اسباب کی شرحِ تمام

مختلف فرقوں کے سادہ ابتدائی دور سے ‏ ‏ کس طرح پیدا ہوئی تمیزِ آقا و غلام

کیوں ہوا دنیا میں سامنتی تمدن کا ظہور — کس لئے قائم ہوا سرمایہ داری کا نظام
کس طرح سرمایہ داری اپنی قوت کے لئے — خون سے مزدور کے پیتی رہی گلرنگ جام
کس طرح سرمایہ و زر کی برآمد بن گئی — بے خبر ملکوں کے گلشن میں شہنشاہی کا دام
کس طرح محکوم قومیں ہو گئیں بیدار آج — توڑنے اٹھے ہیں کیوں صدیوں کی زنجیریں غلام
بھوک اور افلاس کی تاریک شب میں کس لئے — چونک اٹھی ہے بغاوت جاگ اٹھے ہیں عوام

زندگی کی ظلمتوں میں کس طرح مشعل لئے
روس کے مشرق سے ابھرا آفتابِ لالہ فام

یہ تفکر یہ تجسس یہ بصیرت یہ نظر — ذہن میں کرتی ہے وا تاریخ کے عقدے تمام
اخذ کر سکتی ہے دنیا ان سے وہ محکم اصول — نشوِ آدم کے لئے رکھتے ہوں جو حکمِ دوام
زندگی کے ان قوانینِ تغیر پر عبور — قبضۂ انساں میں دیتا ہے زمانے کا نظام
پھیر دے جس سمت چاہے وقت کے دھارے کا رخ — موڑ دے چاہے جدھر تاریخ عالم کی زمام
آئینہ میں آج مستقبل کے آتی ہے نظر — نوعِ انسانی کی حشمت زندگی کا احتشام
اک شعوری کیف میں بڑھتا ہوا منزل کی سمت — لمحہ لمحہ زندگی کا کاروانِ تیز گام
ماہ و پرویں زہرہ و ناہید یہ جبیں و سہا — بخشتا جائے گا ذرات کو انجم کے نام
خاک سے تعمیر ہوتی جنتِ نوعِ بشر — ایک خلدِ اہلِ عالم ایک فردوسِ عوام

آدمی کے پنجۂ محکم میں فطرت کی عناں — آدمی کے دستِ قدرت میں عناصر کی لگام
بحر و بر پر مقدرت، ارض و سما پر اختیار — مہر و مہ کی حکمرانی، روز و شب کا انصرام
عالمِ لاانتہا پر دسترس کے باوجود — خار و خس کی قدر دانی، آب و گل کا احترام
اک نئی تنظیم کو بے چین قلبِ آب و خاک — اک نئی تشکیل کو بے تاب پیداوار خام
اک نئی صبحِ تجلی، اک نئی شامِ جمال — اک نیا مہرِ درخشاں، اک نیا ماہِ تمام
ختم ہوتے نسلِ آدم کی فنا کے تذکرے — ثبت ہوتی زیست کے قرطاس پر مہرِ دوام

یہ بشارت ایک زریں عہدِ استقبال کی
کیا ہے؟ خود تاریخِ انسانی کا اک روشن پیام

(نیا ادب)

غلام ربانی تاباں

زیر و بم

ایک بے پایاں خلا تیرہ و تار
نہ کوئی تارہ نہ مہتاب نہ مشعل نہ چراغ
کوئی مینا نہ ایاغ
چنگ و بربط کی صدا اور نہ پائل کی سہانی جھنکار
تیرگی چھائی ہوئی خامشی لہرائی ہوئی
ایک سیارہ نگاہوں کے افق پر چمکا
مسکرا اٹھی فضا
گنگنا اٹھا سکوت
زندگی جھوم اٹھی — ناچ اٹھی
جیسے جمنا کے کنارے رادھا

سن کے مرلی کی سُریلی تانیں
رقصِ مستانہ کرے
صبحِ جنّت کا سماں، ایک ہی لمحے کے لئے
پھر وہی تیرہ و خاموش فضا
ایک بے پایاں خلا

ہمایوں

معین احسن جذبی

احساس

آج یہ کیوں مجھے احساس ہے اے جانِ حیا
تیری دوشیزگیِ حسن نہیں ہے معصوم

بوئے کوثر تری باتیں ہیں مگر زہر آمیز
مشک و عنبر تری سانسیں ہیں مگر ہیں مسموم

تیری پلکوں پہ لرزتا تو ہے اک اشک مگر
آسمانوں میں دھڑکتے ہی نہیں قلبِ نجوم

جو ہوسناک ربابوں کو جھلس دیتے تھے
اُن شراروں سے ترے گاتے ہوئے لب محروم

جس میں پاکیزگیِ غم کے دیئے تھے روشن
تیری آنکھوں کی وہ اُجلی سی چمک ہے معدوم

اک مجسم سی لطافت کا تصور اے دوست
کل حقیقت تھا مگر آج ہے کتنا موہوم

تو نہ آزردہ ہو اے غیرتِ مریم کہ ابھی
یہ ترا شاعرِ آزاد ہے پابندِ رسوم

جولائی

سائے
سانس
آخری بات
وادیٔ رنگ

ایم۔ڈی تاثیر

سائے

ایسی راتیں بھی کئی گزری ہیں
جب تری یاد نہیں آتی ہے
درد سینے میں مچلتا ہے مگر
لب پہ فریاد نہیں آتی ہے

ہر گنہ سامنے آ جاتا ہے
جیسے تاریک چٹانوں کی قطار
نہ کوئی حیلۂ نیشترکاری
نہ مداوائے رہائی نہ فرار

ایسی راتیں بھی ہیں گزری مجھ پہ
جب ترے راہگزر میں سائے
ہر جگہ، چار طرف مجھے چھائے
کبھی آئے کبھی بھاگے، کبھی بھاگے کبھی آئے!—
تو نہ تھی تیری طرح کے سائے
سائے ہی سائے تھے، رقصاں رقصاں
میں نہ تھا میری طرح کے سائے
سائے ہی سائے تھے لرزاں لرزاں
سائے ہی سائے، ترے راہگزر کے سائے!
ایسی راتیں بھی ہیں گزری مجھ پر
جب تری یاد نہیں آتی ہے
لب پہ فریاد نہیں آتی ہے

(ساقی)

شاد عارفی

ساس

نمک سالن میں اتنا تیز۔ توبہ　　مزعفر "ڈالڈا" آمیز توبہ
بہو اور ساس۔ رستا خیز۔ توبہ

کسے "پلیٹوں" کسے ڈالوں کٹاون"　　کہاں غائب ہے پن کٹی کی "ہاون"
اری مردار۔ یہ آنسوؤں کا "ساون"

ڈراتی ہے مجھے جھڑیاں لگا کر　　گرا دے چلمنیں چیتھڑیاں اڑا کر
کہوں کب تک نہ چل کوٹھے پہ جا کر

یہی اسکول میں سیکھا ہے تو نے　　"بڑے بیباک مغرب کے نمونے"
پڑھایا ہے پڑوسن کی بہو نے

وہ حرافہ کہ۔ اک دن۔ یاد آیا　　"سنیچروار" کو الو منگایا
پکا کر اپنے شوہر کو کھلایا

اِدھر کھایا اُدھر ماری گئی مت　　بدی پر جب اُتر آتی ہے جرأت

بُرائے نام رہ جاتی ہے عورت

اُسی نے... تجھ کو بھی تعویذ گنڈے　　ہوائی قلعوں کے بُرجوں پہ جھنڈے

مرے سر تھتی کھلا دو اُن کو انڈے

مگر میں نے کہا... اللہ... توبہ　　وہ خود چلتے ہیں سیدھی راہ توبہ

ترا وہ لگتا ہے "گھُلّو شاہ"! توبہ

ترا شوہر ہے اس ہندی کا بٹیا　　وہ کب کرتا تھا میں نے سر پیٹا

بُرا ہوتا ہے "قسمت کا لپیٹا"

خدا سمجھے... یہ "ساڑی" کون جامہ　　جو باندھے ساجدہ بن جائے "نتا ما"

لونڈر!.... چھوڑ کر عطر شمامہ

چھچھوندر کا سا بھپکا.... مار ڈالا　　یہ کس بھڑوے نے تجھا پوڈر نکالا

نگاہوں کے لئے مکڑی کا جالا

مسلمانوں میں "ہندی" کی پھٹکار　　صدا دیتی نہیں شیطان کی مار

یہ "ہندو ماسٹرنی" سے جیسے پیار

لیے پھرتی ہے بن شوہر کا بچّہ مگر "مِس صاحبہ" ہونے کا... غچّا
یہ "لے پالک" ہُوا..." تو جان بچا"
ٹکے جاتی ہے منہ کچھ پھوٹ منہ سے نکالا چاہتی ہے کام "او منہ" سے
وہ ہتّڑ سر پہ دُوں سینے پہ "گھوٹنے[1]"

(ہمایوں)

[1] قافیہ کی اس بدعت کو میں اپنی کمزوری سمجھتا ہوں۔

مختار صدیقی

آخری بات

میں نے ان آنکھوں سے دیکھی نہیں وہ بربادی
جس سے باقی نہ رہیں سمت و جہت کی قیدیں
مٹ گیا غرب وہ تہذیب کا مینارہ نور!
شرقِ تیرہ بھی نہیں آج کے دن دنیا میں
(کیا جنوب اور شمال، ان کی نہ دیجیے گا مثال
آج تک ان کا چلن ہو نہ سکا شاملِ حال!)
شہ نشینوں میں تصوّر کے بھی اب کیا ہوں گے
ہر عقیدے کی سیاست کے وہ سب ہیں معبود
بھائی چارے کے کپٹ راج کے، فوقیت کے
دیوتا کل کے — مگر ڈھونڈیئے آج ان کا وجود

آج بربادی ہی دنیا کی خدا ہے گویا
جس نے بربادی ہی کو خلق کیا ہے گویا

جھلستی ہوئی آبادیاں شمشان ہیں اب
ان گنت شہر ہیں ملبے کے سلگتے تودے

جھلسی دیواریں در و بام پہ ہیں نوحہ کناں
کہتی ہیں۔ "اپنا مکیں کوئی کہیں ہو تو سنے

خشت تا من کے اس انبار سے وحشت نہ کرو
آؤ! یہ گھر تھا تمہارا، جہاں تم چھوڑ لے پچھلے

اور اس راکھ کو آنکھوں کا بنا لو سرمہ
یہ وہ دانشکدۂ مشہور ہے تم جس میں پڑھے

وہ تھا سلطانیٔ جمہور کا ایوان عزیز
اس کتب خانۂ نادر کے کھنڈر سے آگے!"

اور مکیں ہو، تو کہے — "میرا وطن یہ تو نہیں
وہ تو تاریخ کا امین تھا، یہ مرگھٹ کی نظیر!"

یہ وہ ہیں جن کا کوئی نام و نشاں ہے تو یہی

کچھ تو یوں مٹ گئے، جیسے کہ کبھی تھے ہی نہیں
ناگاساکی — جو سجل خواب تھی جل پریوں کا
سیم بر کہر میں لپٹا ہوا نیلم کا نگیں
سر پہ اوتار، دلوں کے رشی، وہ مقدس پربت
پاؤں چھوتی ہوئی ذخار سمندر کی جبیں
حامل ثقافت سی آبادیاں، نیلے ساحل
ہر سفینے کے لیے طرفہ طلسموں کی زمیں
اور ہیروشیما — وہ صنعت کا نیا گہوارہ
یعنی مشرق کی ترقی کا امام پیشیں۔
زلزلے آئے، نہ آشوب قیامت سے اٹھے
دونوں اک ذرے کے جوہر کی کرامت سے مٹے!!
اس کرامت سے مگر مٹ کے بھی جو بچ نہ سکا
دیکھئے[1] جا کے وہ پگھلا ہوا، اندھا، پاتال
اس عدم زار میں سرگرم ہیں برقی لہریں
جن کی ترکیب سے ماضی کو ملی صورت حال

[1] ہیروشیما

دیکھتی آنکھوں ذرا دیکھئے سامنے ان کے
خاک کا جن کی کوئی کھوج لگانا ہے محال
کارکن، محنتی مزدور، ہمکتے بچے،
بن گئے دوزخی آسیب کی پُر ہول مثال
یہ ہے قابیل کی تاریخ کا وہ بابِ فنا،
جس پہ عبرت کو بھی ہوتی نہیں رونے کی مجال
تابِ گریہ ہو، تو پھر بھی نہ بہیں گے آنسو
کون فاشسٹ بنے، دین کا، دُنیا کا عدو
اور اب ٹینک اپاہج ہوئے، توپیں ٹھنڈی
پَر شکستہ ہے فلک سیر تباہی کا جنوں
خون سے سینچی ہوئی خاک نے نگلیں فوجیں
جوہرِ ذرّہ نے یوں پھونکا ہے اپنا افسوں
ضامنِ امن اسے مانیے، جیسے تیسے
خون ہی ہم میں نہیں، خون بہے گا کیسے!!

(ساقی)

مسعود حسن

وادیٔ رنگ

آج بس جائے گی یہ وادیٔ رنگ

اپنے دامن میں بہاروں کو لئے
شوخ اور شنگ شراروں کو لئے
آج بس جائے گی یہ وادیٔ رنگ

سرکوہسار یہ سرگوشیاں ہیں
لالہ و گل میں جو مدہوشیاں ہیں
کام دے جائے گا بس ایک ہی سنگ

سیم و زر کے یہ کلس یہ ایواں
دامنِ کوہ کہ فردوس نشاں
دیکھ کر جس کو فرشتے بھی ہوں دنگ

اس میں خوش رنگ حسیں آئیں گے
لالہ رخ، ماہ جبیں آئیں گے
امنگیں ہونٹوں پہ آنکھوں میں ترنگ
نغمے برسائیں ستاروں سے کہو
اور گہری ہوں بہاروں سے کہو
جلترنگ بجنے دو بجنے دو چنگ

ایک دھڑکا ہے مگر جانِ بہار
قلب کہسار سے آتی ہے پکار
ہوئی بیدار رگِ مردہ سنگ
آج پس جائے گی یہ وادئ رنگ

(ہمایوں)

اگست

انتساب
بادبان

اختر ہوشیار پوری

کیوں مرے حال پہ یوں تم نے عنایت کی ہے؟
اس سے پہلے بھی مسافر کئی آئے ہیں یہاں
اور گونجے ہیں اسی راہ میں نغمے جن سے
ایک اک گام پہ تاروں کا گماں ہوتا تھا
کتنی آئندہ بہاروں کا گماں ہوتا تھا
لیکن اس تلخیٔ انجام کو کیا کوئی کہے
اُف یہ غم خانۂ دل کی ابدی تاریکی
تم نے کیوں آج یہاں آنے کی زحمت کی ہے؟

چپ کھڑی سوچ رہی ہو، کہو کچھ تم بھی کہو

میں نے پہلے بھی کئی بار یہ کوشش کی ہے

آرزو میرے مقدر کی سیاہی نہ بنے

زندگی بجھتی ہوئی شام کی تصویر نہ ہو

پہ مگر ظلمتِ غم بڑھتی رہی، بڑھتی رہی

تم سے پہلے بھی یہاں جتنے ستارے ابھرے

کھو گئے تیرہ و تاریک فضاؤں میں تمام

اور اب تم بھی چلی آئی ہو اختر بن کر

ان دھندلکوں کو بدل سکتا نہیں کوئی نظام

میں نے ماضی کے دفینوں سے یہی پایا ہے

تم انہیں دیکھ کے گھبرا تو نہیں جاؤ گی

اب بھی جا سکتی ہو گر لوٹ کے جانا چاہو

(ہمایوں)

کمال احمد صدیقی

بادبان

سمندروں کی نیلگوں فضا سے اب میں بھی رقص کر چکا ہوں بارہا۔

مرے لئے کوئی افق — یہ آسماں کی وسعتیں بھی اجنبی نہیں

میں ان میں سینکڑوں ہزاروں زندگی کے گیت آتشیں دھنوں میں گا چکا — !!

کسی کو ڈھونڈھ ہی رہا تھا — کون جانے کس کو ڈھونڈھتا تھا میں ؟

(ہزار بار ڈھونڈھتا رہا ہوں جس کو موسموں کے مدّ و جزر میں مگر نہ پا سکا !)

ستارے ڈوبنے لگے — اور آندھیوں کی شدّتیں حباب بن کے رہ گئیں !

کسی کو ڈھونڈھتا رہا تھا میں سحر کی نیم نرم شبنمی فضاؤں میں،

کہ آپ آ گئیں۔ اور آ کے چھا گئیں سمندر اور آسماں کی بیکراں خلاؤں میں۔

ہزاروں انتہائیں بحرِ نیلگوں کی چشمِ ناز میں لئے ہوئے،

ہزاروں مہر و ماہ کی تجلیوں کا جسم آئینہ بنا ہوا — !!

میں سوچ ہی رہا تھا لہریں نبضِ کائنات تو نہیں ـــــ!
کہ ایک لہر اُٹھی جس کی برہمی کے سامنے مری تمام قوتیں حباب بن کے رہ گئیں!!
کنارِ ساحل ایک پل میں دیکھتے ہی دیکھتے میں پھر پڑا ہُوا تھا ریت پر ـــــ!!
مرے بدن کی ریت کا ہر ایک ذرّہ ایک آئینہ تھا۔ اور جانے کتنے آفتاب
جگمگا رہے تھے میرے جسم پر!؟

یہ میرا جسم خاک و خوں کا امتزاج ہی سہی،
ہزار میں گناہ گار ہوں تو کیا؟ ـــــ
یہ زلزلے یہ آندھیاں، یہ برق و آتش و شرر مرے مزاج ہی سہی،
مگر سکون پا کے جب بھی شادماں ہوا ہوں، گنگنا اٹھا ہوں، مسکرا دیا

ہوں میں،
مرے اس آہنی تحمّل کے آستاں پہ آسماں کی جنّتیں بھی سجدہ ریز ہو گئیں ـ!!
ـــــ مگر بہت ہی دور آ چکے ہیں ساحلوں کو چھوڑ کر
اگر نہیں ہیں ناریل کے سائے سطحِ آب پر ـــــ تو کیا ہُوا؟
ہوائیں تیز ہیں تو کیا؟ یہ لہریں شعلہ ریز ہیں تو کیا؟ ـــ اُٹھاؤ لنگر اور بادبان کھول دو
میں جانتا ہوں، خوب جانتا ہوں ـ ایک کائنات اور بھی ہے ماورائے کائنات،

برس رہا ہے امرت آسماں سے چاندنی کے روپ میں —!

زمیں؟ زمیں کی کائنات کے لئے نمو ہے دھوپ میں —!

مگر یہ برگ، یہ ثمر، یہ گلستاں! — بغیر رنگ کے تو کچھ نہیں —!!

ستارے ڈوبنے لگے تو کیا؟ — یہ لہریں شعلہ ریز ہیں تو کیا؟؟

اٹھو! — اور اٹھ کے کشتیوں کے بادبان کھول دو —!!

یہ کون کہتا ہے کہ لہروں کا خدا کوئی نہیں؟

یہ لہریں خوب جانتی ہیں ساحلوں کا راستہ —!!!

(ساقی)

ستمبر

انگڑائی
دھرتی کی آواز

عبدالمتین عارف

انگڑائی

کس قدر گہری خامشی ہے محیط
غالباً نصف رات بیت چکی
بام و در یوں فسردہ نما طسم ہیں
بے بسی جیسے اُن کو جیت چکی ہا

چاند مغرب کے ایک گوشے میں
جانے کیوں منہ چھپا کے روتا ہے
کسمساتے ہیں جانے کیوں تارے
جب کہ عالم تمام سوتا ہے

اک بھیانک مہیب سپنے نے
پھونک ڈالا ہے میرا گلشنِ خواب
رہگزاروں پہ بھونکتے کتّے
بھر رہے ہیں حیات میں زہراب

پے بہ پے کروٹیں بدلتا ہوں
نیند پھر بھی مجھے نہیں آتی
ایک تاریک درد کا مسکن
بن رہی ہے مری حزیں چھاتی!

ایک مبہم سکوت کی باہیں
جکڑے لیتی ہیں مجھ کو شدّت سے
پگھلا جاتا ہے آہ میرا وجود
اپنی ہی قوتوں کی حدّت سے!

میری آغوش میں ہے محوِ خواب
میری ملکہ، مری مہارانی
چمنِ زیست کی حسیں تتلی
رقص جس کا ہے حشر سامانی!

اس کے انفاس کی یہ آمد و شد
اس کی بوجھل تھکن کی ہے غماز
دن کی محنت سے چور جسمِ جواں
بن رہا ہے اداسیوں کا ساز!

نغمے اس ساز سے نکلتے ہیں
یاس آگیں، ملول، تیرہ و تار
سنتا جاتا ہوں جیسے جیسے انہیں
بڑھتا جاتا ہے آنسوؤں کا نکھار!

سوچتا ہوں مری رفیقۂ زیست
قبل از وقت ڈھلتی جاتی ہے
یہ مرے گھر کی ضوفشاں قندیل،
شام ہی کو پگھلتی جاتی ہے!

کیا یہ شمعِ حسیں، یہ غیرتِ ماہ
رات بھر بھی نہ جگمگائے گی؟
کیا یہ فکرِ معاش کی آندھی
کچی کلیاں بھی روند جائے گی؟

میری ہمدم کے احمریں رخسار
زرد پڑنے کے واسطے تو نہیں!
اس کے جوبن کی گرم محرابیں
سرد پڑنے کے واسطے تو نہیں!!

ادھ کھلے گُل مسل دیئے جائیں
یہ مشیت نہیں، نہیں زنہار
یہ تو افیونِ زرگراں ہے کہ جو
ہم غریبوں کو بخشتی ہے قرار!

جانے تجھ جیسے کتنے نازک دل
ان جفاکاروں سے دکھے ہونگے
جانے تجھ جیسے کتنے مہ پارے
یہ سیہ ناگ ڈس چکے ہوں گے!

میری محبوب تیری خاطر اب
مجھ کو ان موذیوں سے لڑنا ہے
شعلۂ انتقام دل میں لئے
رعد کی طرح سے بپھرتا ہے

یہ محلّات جن کی اینٹوں سے،
بے نواؤں کا رِس رہا ہے لہو،
ان محلّات کے مکینوں سے
مجھ کو لینا ہے خون بہا، دوستو!

تیری ان بلگجی سی زلفوں میں
مجھ کو اب سیمیں تارے چننے ہیں
تیرے ان خشک مردہ ہونٹوں سے
زندگی کے ترانے سننے ہیں!

(نیا دور)

نصرت آرا نصرت

دھرتی کی آواز

بادلو! دھند کی مانند بکھرنا سیکھو!
یہ بھی کیا اوجِ ثریا پہ گرجتے رہنا
زخمی چیتے کی طرح خود پہ بگڑتے رہنا
یا تو آنا ہی نہ دھرتی کی عبادت کے لئے
اور جو آنا تو وہی برق سی بن کر آنا
کسی نادار کے خرمن کو جلانے کے لئے
کسی مفلس کی ٹھٹھرتی ہوئی کٹیا کے قریب
اس کے معصوم سے بچے کو بھسم کر جانا

بادلو! دھند کی مانند بکھرنا سیکھو

اک ردا بن کے بکھر جاؤ مری دنیا پر
اپنے دامن میں چھپا لو میرے سب بچوں کو
یہ بلکتے ہوئے ہنستے ہوئے معصوم سے لوگ
جن کے ہاتھوں میں کھلونے ہیں زر و سیم کا بار
یوں بکھر جاؤ کہ اک دل کو بھی محسوس نہ ہو
ہمسفر کتنے کھلونوں کا بنا ہے ہالک ــــ
کہ زر و سیم کی تقسیم کا یہ جرم، فریب
میرے بچوں کی ہلاکت کا بنا ہے موجب
بادلو! آؤ اُٹھو آؤ مری دنیا پر!

(ساقی)

اکتوبر

پچھلے پہر
جنگلی پھول

اشعر ملیح آبادی

پچھلے پہر

رات کی وادیٔ تاریک میں دنیا گم ہے
جانے کس سوچ میں جاتا ہے یہ مہتاب تمام
سانولی رات کے پُر کیف نظارے ہیں خموش
خواب کی گود میں سوئی ہے فضاؤں کی دلہن
کتنا چپ چاپ اندھیرا ہے درختوں کے تلے
جیسے اک مرگ نما خواب کا خاموش نزول

ماہِ تاباں کی بھٹکتی ہوئی نازک کرنیں
کھیلتی جاتی ہیں مرمر کی روش پر بیکار
کھیلتے کھیلتے کچھ دیر میں سو جائیں گی

اور پھر کھیل کے انجام پہ پچھتائیں گی

ماہ و انجم کی زبانوں پہ سکوتِ جاوید
دیکھ کر جن کی نگاہوں کی گراں خوابی کو
درد کی آگ میں شعلہ سا بھڑک جاتا ہے
جھلملاتے ہوئے تاروں کی درخشاں کرنیں
قلبِ افسردہ میں نشتر سے چبھو دیتی ہیں

یاد کے نرم دریچوں سے ترا روئے حسیں
جانے کس طور سے ابھرا ہی چلا آتا ہے
دیکھ کر نور سے معمور ستاروں کے نقوش
ترا تاروں بھرا آنچل مجھے یاد آتا ہے
کہکشاں کا یہ لچکتا ہوا انداز حسیں
تیرے خم کھاتے ہوئے لب کا خیال آتا ہے

بھیگتی رات کے جادو سے جہاں ہے مسحور
آہ لیکن مری آنکھوں میں ابھی خواب کہاں
ان دریچوں کے چھلکتے ہوئے آئینوں سے
جیسے یہ رقص کناں بوندیں پھسل جاتی ہیں
یونہی آنکھوں سے نکلتے ہوئے خاموش آنسو
آپ ہی آپ ڈھلکتے ہوئے گر جاتے ہیں
گل ہوئے جاتے ہیں مایوس امیدوں کے نجوم
سانس تھک تھک کے مری چور ہوئی جاتی ہے
بے خبر رات مرے ساتھ چلی جاتی ہے

(ہمایوں)

وشوامتر عادل

جنگلی پھول

تری نگاہوں میں جنگلی پھول کھل رہے ہیں
تری اداؤں میں مسکراتی ہیں وہ بہاریں جو ذرّے ذرّے پہ چھا گئی ہیں
لچکتی شاخوں پہ گنگناتا ہے ایک ننھا سا قرمزی رنگ کا پرندہ
لچکتی شاخوں کا سبز جوبن نکھر رہا ہے
لچکتی شاخوں کی تھرتھراہٹ تمام جنگل کی روح کی نرم دھڑکنیں ہیں
لچکتی شاخوں نے اپنی پتلی سی انگلیوں سے
سفید بہتی ہوئی ندی کی جڑوں سے الجھی ہوئی لٹوں کو تھپک لیا ہے
مگر ندی اورا بہتی ہے
جڑوں سے لپٹے ہوئے، دمکتے ہوئے شگوفے
ندی کی آنکھوں میں جھانکتے ہیں

مگر ندی اور ہانپتی ہے ـــــ

تری نگاہوں میں جنگلی پھول کھل رہے ہیں
مری نگاہوں میں آج بھونرے مچل رہے ہیں
مری تھکی ہاری زندگی مسکرا اٹھی ہے
کہ جس طرح ڈوبتی ہوئی شام آخری بار مسکرا دے،

تری نگاہوں کے جنگلی پھول چوم کر واپس آ گیا ہوں
ترے جہاں کو بھلا رہا ہوں
مرے جہاں میں ابھی تو صحرا ہیں اور بے برگ جھاڑیاں ہیں ـــــ

(ساقی)

نومبر

عروسِ بہار
شراب

سیّد جابر علی

عروسِ بہار

خموش ڈوبتے سورج کی آخری کرنیں
اداس جھیل کے سینے پہ تھرتھرانے لگیں

کسی مریض کی جیسے تھکی ہوئی آواز
فضائے تیرہ میں تحلیل ہو کے رہ جائے
زمیں پہ پھیل گئے نیم جاں حزیں سائے

کہانیاں سی فضاؤں میں سرسرانے لگیں
جلو میں سیکڑوں یادوں کا اضطراب لئے
وہ خواب ہائے طربناک پھر ابھرنے لگے

لبِ بہار پہ رقصاں تھا جن کا افسانہ
دلِ فسردہ کو بیتابیاں ملیں جن سے
نگاہِ شوق کو رعنائیاں ملیں جن سے

پھر ایک بار نگاہوں میں رقص کرنے لگے
تبسموں کا وہ رنگیں طلسم ٹوٹ گیا؟
ہر ایک سمت پہ افشاں ہے ظلمتوں کا غبار
جھلس کے رہ گیا مدہوش نکہتوں کا ہجوم
پڑی ہے خاک پہ نوحہ کناں عروسِ بہار

(ادبی دنیا)

سلام مچھلی شہری

شراب

ستمبر کی شب کی سنہری حسینہ !
ابھی تو گھڑی میں سوا دس بجے ہیں
ابھی گذرگاہ کے آنچلوں پہ
اسی طرح یہ قمقمے ہنس رہے ہیں
ابھی تو وہی ساز سنگیت کی لے جسے بار میں چھوڑ کر آرہا ہوں، اسی طرح
رُک رُک کے لہرا رہی ہے
ابھی تو سر راہ سادے دوپٹے سنہرے غرارے سنہرے غراروں میں چاندی کے ٹکڑے
جھلک اپنی رہ رہ کے دکھلا رہے ہیں

—— عروس مہ نو !
ذرا رات ڈھل جائے۔ خاموش ہو لیں ہجوم طرب سے یہ پُر شور سڑکیں

تو میں تجھ سے جی بھر کے باتیں کروں گا۔

ہماری یہ باتیں کوئی سن نہ لے، اس لئے ڈر رہا ہوں

تجھے بھی کوئی دیکھ لے، کیا کروں گا

تجھے بھی کوئی مانگ لے، کیا کروں گا

کہ میں بھی تو اک فرد ہوں انجمن کا

وہی انجمن جو مئے و جام کی مسکراہٹ سے سج کر حسینوں کے ہونٹوں
سے ٹکرا رہی ہے

ابھی تک مرے ان مہکتے لبوں سے صدا جس کے اک ساز کی آ رہی ہے!

— قسم ہے تری منتظر خامشی کی

کہ میں تجھ سے جی بھر کے باتیں کروں گا

ذرا رات ڈھل جائے

سوئے زمانہ۔ تجھے اپنے ان بازوؤں سے لگا لوں

تجھے اپنے ان آنسوؤں میں چھپا لوں

جنہیں کل مئے ناب کی شکل دے کر

مجھے نذر کرنا ہے بزم طرب میں —؟!!

(ساقی)

دسمبر

امروز

جاگیر

پاگل کوّے

جنیش

مراجعت

مجید امجد

امروز

ابد کے سمندر کی اک موج جس پر مری زندگی کا کنول تیرتا ہے
کسی ان سنی، دائمی راگنی کی کوئی تان — آزردہ، آوارہ، برباد
جو دم بھر کو آ کر مری الجھی الجھی سی سانسوں کے سنگیت میں ڈھل گئی ہے!
زمانے کی پھیلی ہوئی بے کراں وسعتوں میں یہ دو چار لمحوں کی میعاد
طلوع و غروبِ مہ و مہر کے جاودانی تسلسل کی دو چار کڑیاں!
یہ کچھ مختصر مختصر سے اجالوں کا رومان! یہ کچھ سسکتے اندھیروں کا قصہ!
یہ جو کچھ کہ میرے زمانے میں ہے اور یہ جو کچھ کہ اس کے زمانے میں میں ہوں!
یہی میرا حصہ — ازل اور ابد کے خزانوں سے ہے بس یہی میرا حصہ!

مجھے کیا خبر وقت کے دیوتا کی حسیں رتھ کے پہیوں تلے پس چکے ہیں

مقدر کے کتنے کھلونے زمانوں کے ہنگامے صدیوں کے صدہا بگولے!
مجھے کیا تعلق: مری آخری سانس کے بعد بھی دوشِ گیتی پہ مچلے
مہ و سال کے لازوال آبشارِ رواں کا وہ آنچل جو تاروں کو چھو لے
مگر آہ یہ لمحۂ مختصر جو مری زندگی، میرا زادِ سفر ہے!
مرے ساتھ ہے، میرے بس میں ہے، میری ہتھیلی پہ ہے یہ لبالب پیالہ!
یہی کچھ ہے لے دے کے میرے لئے اس خراباتِ شام و سحر میں یہی کچھ
یہ اک فرصتِ کاوشِ دردِ ہستی! یہ اک مہلتِ کوششِ آہ و نالہ!

یہ صہبائے امروز، جو صبح کی شہزادی کی مست انکھڑیوں سے ٹپک کر
بہ دورِ حیات آ گئی ہے! یہ ننھی سی چڑیاں جو چھت میں چہکنے لگی ہیں!
ہوا کا یہ جھونکا جو میرے دریچے میں تلسی کی ٹہنی کو لرزا گیا ہے!
پڑوسن کے آنگن میں پانی کے نلکے پہ یہ چوڑیاں جو چھنکنے لگی ہیں!
یہ دنیائے امروز میری ہے، میرے دلِ زار کی دھڑکنوں کی امیں ہے!
یہ اشکوں سے شاداب، دو چار صبحیں، یہ آہوں سے معمور، دو چار شامیں
انہی چلمنوں سے مجھے دیکھنا ہے وہ جو کچھ کہ نظروں کی زد میں نہیں ہے!

ساحر لدھیانوی

جاگیر

پھر اُسی وادیٔ شاداب میں لوٹ آیا ہوں
جس میں پنہاں مرے خوابوں کی طرب گاہیں ہیں
میرے احباب کے سامانِ تعیّش کے لیے
شوخ سینے ہیں جواں جسم حسیں باہیں ہیں

سبز کھیتوں میں یہ دبکی ہوئی دوشیزائیں
ان کی شریانوں میں کس کس کا لہو جاری ہے
کس میں جرأت ہے کہ اس راز کی تشہیر کرے
سب کے لب پر مری ہیبت کا فسوں طاری ہے

ہائے وہ گرم و دل آویز اُبلتے سینے
جن سے ہم سطوتِ آبا کا صلہ لیتے ہیں

جانے ان مرمریں جسموں کو یہ مریل دہقاں
کیسے ان تیرہ گھروندوں میں جنم دیتے ہیں
یہ لہکتے ہوئے پودے، یہ دہکتے ہوئے کھیت
پہلے اجداد کی جاگیر تھے، اب میرے ہیں
یہ چراگاہ، یہ ریوڑ، یہ مویشی، یہ کسان
سب کے سب میرے ہیں، سب میرے ہیں، سب میرے ہیں

ان کی محنت بھی مری، حاصل محنت بھی مرا
ان کے بازو بھی مرے، قوت بازو بھی مری
میں خداوند ہوں اس وسعت بے پایاں کا
موج عارض بھی مری، نکہت گیسو بھی مری

میں ان اجداد کا بیٹا ہوں جنھوں نے پیہم
اجنبی قوم کے سائے کی حمایت کی ہے
غدر کی ساعت ناپاک سے لیکر اب تک
ہر کڑے وقت میں سرکار کی خدمت کی ہے

خاک پہ رینگنے والے یہ فسردہ ڈھانچے
ان کی نظریں کبھی تلوار بنی ہیں، نہ بنیں
ان کی غیرت پہ ہر اک ہاتھ جھپٹ سکتا ہے
ان کے ابرو کی کمانیں نہ تنی ہیں نہ تنیں

ہائے یہ شام، یہ جھرنے، یہ شفق کی لالی
میں ان آسودہ فضاؤں میں ذرا جھوم نہ لوں؟
وہ دبے پاؤں اُدھر کون چلی جاتی ہے!
بڑھ کے اس شوخ کے ترشے ہوئے لب چوم نہ لوں؟

(سویرا)

سلام سندیلوی

پاگل کوّے

پاگل کوّے! مت بول یہاں، ہے کون یہاں آنے والا
مجھ سے تو خفا ہے سارا جہاں، ہے کون یہاں آنے والا

میری دیوار پہ تو بیٹھا، کیوں پاپی شور مچاتا ہے
مت بول یہاں سے اب اُڑ جا کیوں دل کو اور دکھاتا ہے
کیوں کانوں کو جھٹلاتا ہے کیوں نظروں کو بہکاتا ہے
سینے کی دبی چنگاری کو، کیوں دے کے ہوا بھڑکاتا ہے
اٹھتا ہے میرے سینے سے دھواں، ہے کون یہاں آنے والا
پاگل کوّے! مت بول یہاں، ہے کون یہاں آنے والا

بہکے کوّے! سن بات مری گھبرا کے ڈگر کیا بھول گیا
کچھ غور تو کر، کچھ سوچ تو لے جلدی میں نگر کیا بھول گیا

جس کے گھر تجھ کو جانا تھا، تو اس کا گھر کیا بھول گیا
کیا نقشہ تجھ کو یاد نہیں، دیوار و در کیا بھول گیا

سچ مان، نہیں ہے یہ وہ مکاں، ہے کون یہاں آنے والا
پاگل کوتے سے مت بول یہاں، ہے کون یہاں آنے والا

اک پیارا باپ تھا جس کی ہے اس باغ میں تربت برسوں سے
اک بڑھی ماں ہے گاؤں میں جس کو ہے نقاہت برسوں سے
اک بھائی کہیں پردیس میں ہے جس سے ہے عداوت برسوں سے
کچھ ہیں اہل رشتہ جن سے ہے ترکِ محبت برسوں سے

پھر سوچ سہی تو ہی ناداں، ہے کون یہاں آنے والا
پاگل کوتے سے مت بول یہاں، ہے کون یہاں آنے والا۔

بھولے کوتے! میرا ہے یہاں اپنا اور بیگانہ دشمن
جو پہلے راز کے محرم تھے اب وہ ہیں در پردہ دشمن
دشمن ہے وطن میں ہمسایہ، پردیس میں ہم پیشہ دشمن
بس اور زیادہ کون کہے خود اپنا ہے سایہ دشمن

پھر کس کے آنے کا ہو گماں، ہے کون یہاں آنے والا
پاگل کوتے مت بول یہاں، ہے کون یہاں آنے والا

تیری بولی سے اے پنچھی اک پچھلی چوٹ ابھر آئی
ہائے وہ زمانہ چلتی تھی، جب ٹھنڈی ٹھنڈی پُروائی
جب دھان کی مینڈ پہ بجتی تھی، الفت کی سُریلی شہنائی
جب وہ باتیں کرتے کرتے لیتی تھی پیار کی انگڑائی

اب وہ بھی خفا ہے جانِ جہاں، ہے کون یہاں آنے والا
پاگل کوّے امت بول یہاں، ہے کون یہاں آنے والا

چھوٹے کوّے! اب اُڑ بھی جا، یاں آن ہمارا کوئی نہیں
اب میں نہ کسی کا پیارا ہوں، اب میرا پیارا کوئی نہیں
ساتھی ہے سلام اپنا ہی وہم، بس اور سہارا کوئی نہیں
گرداب سمندر، تاریکی طوفان، کنارا کوئی نہیں

منجدھار میں اب کشتی ہے، سوال ہے کون یہاں آنے والا
پاگل کوّے مت بول یہاں، ہے کون یہاں آنے والا

(ہمایوں)

فکر تونسوی

جینئس

(GENIUS)

میں صدیوں سے تنہا چلا آ رہا ہوں
میں صدیوں سے غولِ بیاباں کے زنداں میں گھبرا رہا ہوں،
میں خاموش ہوں جیسے معبد کے گوشے میں کوئی بتِ ایستادہ
مرے ذہن پہ میری تنہا اپنی ہی عظمت کی مُہریں لگی ہیں

—— یہ کونین پر کیوں مسلّط ہے اک ہُو کا عالم؟
یہ سیمیں ستارے ہیں یا چاند نے اپنی تنہائیوں پر بہائے ہیں آنسو؟
ہوا کی پری سانس روکے، پروں کو سمیٹے ہوئے تھم گئی ہے۔

مرے گرد لاکھوں صدائیں بگولا صفت گھومتی ہیں۔
ابھارے چلی جا رہی ہیں مرے گردِ زنداں کی سنگیں فصیلیں
بڑھائے چلی جا رہی ہیں مرے دل کی سنسانیوں کو
میں تنہا ہوا جا رہا ہوں۔

مرا غم ——— تمہارے "تحیر" کے بس کا نہیں ہے
نکلنے دو مجھ کو ——— بگولوں کے زنداں میں دم گھٹ رہا ہے
یہ اک چپکا چپکا تبسّم جو میرے لبوں پہ ابھرتا رہا ہے ———
تبسّم نہیں ہے
کہ یوں بھی مری چشمِ عظمت نے آنسو بہائے
یہ آنسو ——— یہ طنزِ مسلسل کہاں تک مرا ساتھ دیں گے؟
کہاں تک میں یوں اپنے اوپر ستم ڈھا سکوں گا؟
کہاں تک تمہارے لئے خود کو بہلا سکوں گا؟
کہ میری صدا، جو بتِ خامشی بن گئی ہے
اسے چاند تاروں، بہاروں سے نسبت رہی ہے۔

نکلنے دو مجھکو ـــــ ستاروں بہاروں سے ملنے دو مجھکو
تمہارے تحیّر کو میں چھوڑ جاؤں گا زنداں کے در پہ
میں گھبرا رہا ہوں ـــــ میں تنہا ہوا جا رہا ہوں۔
میں تنہا نہیں رہ سکوں گا ـــــ!

(سویرا)

منیب الرحمٰن

مراجعت

حسین خوابوں کے تانے بانے شکستہ ہو ہو کے گر رہے ہیں
حسین خوابوں کی جلوہ سامانیاں حقیقت کی تلخیوں میں بدل گئی ہیں

میں دیکھتا ہوں
میں دیکھتا ہوں تجلیاتِ سحر نے پھیلا دیا ہے اک جال سا فضا میں!

میں سوچتا ہوں
میں سوچتا ہوں کہ دستِ ہستی اجل کی شیرازہ بندیوں کو بکھیرنے پہ
تلے ہوئے ہیں

میں سن رہا ہوں
میں سن رہا ہوں صدائے ماتم بلند ہوتے ہوئے ہر اک کوچہ و مکاں سے!
مری نگاہوں کو تابِ نظارگی نہیں ہے

میرا تخیل لٹا چکا ہے متاعِ احساس، دولتِ غم
مری سماعت پہ بار ہوتا ہے بزمِ ہستی کا شور و غوغا
مگر میں موت و حیات کی کشمکش میں اب تک پھنسا ہوا ہوں
میں جی رہا ہوں کہ میرے جینے میں کوئی سود و زیاں نہیں ہے
میں مر نہیں سکتا کیونکہ ڈر ہے مجھے ہزاروں قیامتوں کا!

مجھے نہ چھیڑو! [illegible]
شب بسر کر لوں مجھے نہ چھیڑو!
میں رات بھر کا جگا ہوا ہوں، شب بسر کر لوں مجھے نہ چھیڑو!
کبھی وہ دن تھے کہ میں تمہاری جدائی میں بے قرار رہتا
مجھے اگر کوئی آرزو تھی تو یہ کہ تم میرے پاس آؤ
میں تم سے باتیں کروں، تمہاری برہنہ رعنائیوں سے کھیلوں
اور ایک وارفتگی کے عالم میں پھر تمہیں ہمکنار کر لوں
مگر وہ دن داستانِ ماضی کے حرفِ آغاز بن چکے ہیں
مجھے اب ایسی طویل راتوں کی جستجو ہے

جو میری بیتابیوں کو وقفِ سکوت کر دیں!

بہار آتی ہے صحنِ گلزار میں خزاں کی نقیب بن کر
یہ پھول کھلتے ہیں تاکہ مرجھا کے شاخِ نازک سے ٹوٹ جائیں۔
مرا تبسم بھی اشک ریزی کا ہے بہانہ
ملی ہوئی ہے مری مسرت میں نیشِ ہستی کی تلخ کامی!!
وہ پوچھتے ہیں "تمہارے نغموں میں اس قدر حزن و یاس کیوں ہے؟
بتاؤ کیا تم ہمیشہ آہ و فغاں کے یوں خوشہ چیں رہو گے؟
ذرا نگاہیں اٹھا کے دیکھو
سحر کے انوار نقشِ فردا کا اک ہیولیٰ بنا رہے ہیں
چمن میں مرغانِ خوشنوا چہچہا رہے ہیں
وہ اپنے کندھوں پہ ہل اٹھائے کسان کھیتوں کو جا رہے ہیں
وہ انقلابی جواں بغاوت کے تند نغموں سے ایک طوفاں
اٹھا رہے ہیں۔
وہ مرد و زن فصلِ گل کی آمد سے شاد ہو ہو کے گا رہے ہیں ——

تمہاری ہستی کو اس کا احساس کیوں نہیں ہے ؟"

میں کیا بتاؤں !
میں ان سے کیسے کہوں کہ یہ بازگشت ہے میرے دورِ ماضی کے
ہاؤ ہو کی۔

یہی ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے، یونہی ہوتا رہے گا ہیہم !
یہ نوجواں گاتے گاتے تھک جائیں گے تو ان کے شرر فشاں،
برق پاش نغمے
انہیں حقیقت سے دور خوابوں کی ظلمتوں میں دھکیل دیں گے
اسی کو سمجھیں گے وہ کمالِ وجود و معراجِ آدمیت
اسی پہ رکھیں گے چار و ناچار پھر وہ بنیادِ قصرِ ہستی !!

یہ سونے چاندی کے چند سکے
یہ گندم و جو کے چند دانے
مرے لیے مشتِ خاک سے بیشتر نہیں ہیں !!

مگر کسی کی نگاہِ الفت
وہ اشک جن کو کسی نے میرے غموں کا ہمراز کر دیا تھا
وہ اک تبسم لطیف و شیریں
مرے خیالوں میں تا ابد جاگزیں رہیں گے،
میں جب بھی چاہوں انہیں اٹھا لاؤں منظرِ عام پر تصوّر کی خلوتوں سے
میں جیسا چاہوں انہیں بنا دوں ——!

(سویرا)